R. No. 2166/57

Regd. No. L. 927

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون ۔
قیمت فی پرچہ
سالانہ چندہ

جلد ۲۵ ۔ شمارہ ۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ء

اداریہ

ایک ہیرو کی موت

ٹیگور کی ایک نظم ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب سورج ڈوبا تو ساری دنیا میں اندھیرا ہوگیا اور لوگ پریشان ہوگئے۔ پھر ایک مٹی کا دیا جلا اور اس کی روشنی نے تاریکی اور تنہائی کے احساس کو زائل کر دیا۔

مئی ۱۹۶۴ء میں جب جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تھا تو ہندوستان ایک تاریکی اور تنہائی کے احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے اپنے خلوص و خدمت، فہم و فراست اور تدبر و دانائی سے ملک کو مشکلات سے نکالا اور جمہوریت اور سیکولرزم کو استحکام بخشا۔ شروع میں لال بہادر شاستری کے انکسار نے لوگوں کو دھوکا دیا۔ ان میں وہ علمی و ادبی ذوق اور شخصیت کی وہ چمک دمک نہ تھی، جو جواہر لال نہرو کا خاصہ تھی مگر انھوں نے نہرو کے نصب العین کو اپنایا، ان کے نقش قدم پہ چلے، مشکلات میں ہمت سے کام لیا، کامیابی میں اترائے نہیں، دشواریوں سے ہراساں نہیں ہوئے۔ ان کی صحت بہت اچھی نہیں تھی، وزیر اعظم ہونے سے پہلے ایک دفعہ دل کی بیماری کے شکار ہو چکے تھے۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد پھر تھوڑی سی شکایت ہوئی، لیکن انھوں نے کام کو مقدم سمجھا اور ملک کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا۔ چین کا خطرہ موجود تھا کہ پاکستان نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ رن کچھ میں پاکستان نے کچھ گڑبڑ کی، ہندوستان کو جوابی کارروائی کرنی پڑی، مگر برطانیہ کے وزیر اعظم نے جب مصالحت کی کوشش شروع کی تو انھوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم کو امن کا آرزومند پایا۔ چنانچہ رن کچھ کے عہد نامے پر دستخط ہوگئے مگر اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ کشمیر میں پاکستان نے مداخلت کار بھیج کر ہمارے ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانا چاہا۔ اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مجبوراً ہندوستان کو جواب میں فوجی کارروائی کرنی پڑی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ گاندھی، نہرو اور شاستری کا ہندوستان جو امن کا حامی ہے، وقت پڑنے پر ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے اور دوسروں کے جنگی منصوبوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ ہندوستان نے پاکستان کے اقدام کو صرف روک ہی نہ دیا بلکہ ہماری فوجیں لاہور اور سیالکوٹ کے قریب پہنچ گئیں۔ مگر جب یو۔ این۔ او کے سکریٹری جنرل نے مصالحت کی کوشش کی تو پھر شاستری کو لڑائی بند کرنے اور مل بیٹھ کر تمام مسائل حل کرنے کے لیے آمادہ پایا۔ بہرحال اٹھارہ دن کی لڑائی کے بعد عارضی صلح ہوگئی اور ایک عالمگیر جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ پھر جب روس کے وزیر اعظم نے ہندوستان اور پاکستان کو دعوت دی کہ وہ تاشقند میں باہمی گفتگو کے لیے جمع ہوں تو شاستری کو اس کے لیے بھی تیار پایا۔ یہ چھوٹے سے قد کا انسان بڑا دل و دماغ رکھتا تھا۔ اسے امن عالم سے محبت تھی، مگر اس کی امن کی خواہش کسی کمزوری کی بنا پر نہیں تھی، انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے لگاؤ کی وجہ سے تھی۔ وہ جنگ کی تباہ کاریوں کو سمجھتا تھا اور جب مجبور ہو جاتا تھا تو دشمنوں کے ہر منصوبے کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ تین جنوری کو جب شاستری تاشقند روانہ ہوئے تو ساری دنیا کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے وہاں ایک ہفتے تک صبح سے شام تک امن کے لیے جدوجہد کی اور جب بالآخر روس کے وزیر اعظم کی مدد سے امن کے لیے فضا تیار ہوگئی تو نو نکات کے ایک مشترکہ اعلان پر ہندوستان اور پاکستان

اس شمارے میں

کے دستخط ہو گئے۔ ان نکات کی رو سے تمام مسائل کو باہمی گفتگو سے طے کرنے اور تعلقات بحال کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ آخری دن تو بہت سویرے سے دیر رات گئے تک شاستری مصروف رہے۔ رات کو تاشقند میں مشترکہ اعلان پر دستخط ہو جانے کی خوشی منائی جا رہی تھی اور ہندستان اپنے ہیرو کی شاندار واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ صبح دل کی حرکت بند ہو جانے سے ان کے انتقال کی دلدوز خبر ملی۔ کیا کیا جائے خدا کی مرضی یہی تھی۔

مگر شاستری جیسے رہنما اور رہبر کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہ ہو سکے گا۔ اس مخلص، منکسر مزاج، اصول پرست، امن پسند ملک و قوم کے عاشق، جمہوریت اور سیکولرزم کے پرستار، اخلاقی قدروں کے علمبردار، نقصان کا بدل دستیاب نہ ہو سکے گا۔ اس کی یاد میں آنسو بھی بہائے جائیں گے اور ماتم بھی ہوگا اور ہونا چاہیے۔ مگر ماتم کرنے سے کام نہ چلے گا۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم سب اس کے نقش قدم پر چلیں۔ اس کی طرح ملک و قوم کی اور انسانیت کی خدمت اپنا شعار بنائیں۔ اپنے سے عہد کریں کہ ہم ہر حال میں جمہوریت اور سیکولرزم کا علم اونچا رکھیں گے۔ اندرونی دشمنوں کو دور کریں گے۔ بیرونی خطروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ قومی یک جہتی کو فروغ دیں گے۔ ملک و قوم کو ترقی اور خوش حالی کی منزل کی طرف لے جائیں گے۔ ہمیں دنیا کو دکھانا ہے کہ گاندھی، نہرو... شاستری کا ملک ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلتا رہے گا اور اس شاندار مستقبل کی طرف ہر حال میں گامزن رہے گا جو اس کا مقدر ہے۔ لال بہادر شاستری تو جو کچھ کر سکتے تھے کر گئے اور امر ہو گئے دیکھنا ہے کہ ہم سب ان سے عقیدت اور محبت رکھتے ہوئے ان کے چراغ سے کس طرح چراغ جلاتے ہیں اور دنیا کے اندھیرے میں کس قدر اجالا کرتے ہیں۔ — جے ہند۔

تاشقند میں ساغر نظامی کی ساٹھ سالہ سالگرہ

تاشقند ۲۵؍ دسمبر کی شام کو تاشقند یونیورسٹی کے دوم اسپیرانت (گریجویٹس ہاؤس) میں حضرت ساغر نظامی کی ساٹھ سالہ سالگرہ کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں یونیورسٹی کے طلبہ، اساتذہ، اردو دوستوں اور تاشقند میں مقیم ہندوستانی طلبہ نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت سرکاری اشاعت گھر کے مہتمم جناب طاہر ابراہیموف نے کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی تقریر میں ساغر نظامی کی شخصیت اور شاعری کے بعض نمایاں پہلوؤں مثلاً وطن پرستی، انسان دوستی اور رجائیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے جدید شاعری کو قومی شاعری کا رنگ دیا۔ جناب نبی محمدوف نے اپنی تقریر میں یاد دلایا کہ ساغر نظامی کے جد اعلیٰ سردار شہباز خاں کو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بغاوت کے جرم میں پھانسی کی سزا دی تھی۔ موصوف نے کہا کہ ازبک کہاوت کے مطابق شیر کا بیٹا شیر ہی ہوتا ہے۔ ساغر نظامی بھی ساری زندگی اپنے قلم اور اپنے عمل سے انگریزوں کی جابرانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی آواز ملک و قوم کی اور حق و صداقت کی آواز تھی اس لیے اس کی فتح ہوئی۔ جناب نبی محمدوف نے ساغر نظامی کی ایک غزل اور ایک نظم پہلے اردو میں ترنم کے ساتھ سنائی اور پھر ان کا ترجمہ ازبکی زبان میں پیش کیا۔ ترجمے میں اصل نظموں کی بحریں اور قافیے برقرار رکھے گئے۔ اردو کے ایک طالب علم زیاداللہ نے ساغر نظامی کی ایک غزل خوش گلوئی کے ساتھ گائی۔

جناب فتح منشا اتف نے اپنی تقریر میں دہلی میں ساغر نظامی صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ میں نے ایک اعلیٰ شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت سنی تھی لیکن ان کو ایک بلند اور نفاست پسند انسان بھی پایا۔ آخر میں صدر جلسہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور ساغر نظامی صاحب کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے اپنی دلی خواہشات کا اظہار کیا۔ جلسہ کی کارروائی تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔

وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے انتقال پر
مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کا تعزیتی جلسہ

علی گڑھ ۱۱ جنوری۔ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے اچانک انتقال کی خبر ملتے ہی دفتر مرکزی انجمن میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا اور دفتر دو روز کے لیے بند کر دیا گیا۔

جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور نے شریمتی للتا شاستری اور جناب گلزاری لال نندہ کو تعزیتی تار دیے۔

(نامہ نگار)

دو ماہی ہمایوں شایع ہو گیا

دہلی ۲۷ دسمبر۔ یہ خبر ادبی حلقوں میں دلی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور ادیب جناب تاجور سامری کی ادارت میں دہلی سے دو ماہی ہمایوں کا پہلا شمارہ شایع ہو گیا۔ امید ہے کہ اردو دوست اس کا دامے درمے سخنے قدمے خیر مقدم کریں گے۔

اردو کی کرامت

تاشقند ۹ جنوری۔ ہندستان اور پاکستان کے درمیان قریبی رابطہ کی زبان کی حیثیت رکھنے والی "اردو" زبان اپنی کرامت کا مظاہرہ تاریخی تاشقند کانفرنس میں بھی کر رہی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر ایوب خاں بیشتر گفت و شنید اردو میں کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ وزیر اعظم شاستری اچھی خاصی اردو جانتے ہیں اور ایک زمانہ میں ایک اردو اخبار کے نامہ نگار کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

مثنوی عشق نامہ مصنفہ واجد علی شاہ

کچھ دنوں سے ہماری زبان کے صفحوں میں واجد علی شاہ کی مثنوی عشق نامہ موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔ اس بحث میں حصہ لینے والے اس موضوع سے کافی واقفیت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے بحث کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اور ایک فی الجملہ جامع مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ یہی احساس اس مضمون کی اشاعت کا محرک ہوا۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

جس طرح بعض اخلاقی جرأت اور راست گوئی کی ہمت رکھنے والے لوگوں نے اپنے confessions (اعترافات) لکھ کر اپنے عیب و ہنر بے نقاب کر دئے ہیں، اسی طرح واجد علی شاہ نے عشق نامے میں اپنی عشق و محبت کی داستانیں بے کم و کاست خود اپنے قلم سے لکھ دی ہیں۔ سطحی نگاہوں کو یہ داستانیں عیاشی و عیش پرستی کی دستاویزیں دکھائی دیں گی، لیکن جو لوگ اس زمانے کے والیانِ ریاست، رؤسا اور امرا کی نجی زندگی سے باخبر ہیں، اُن کو اِن داستانوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئے گی۔ اگر کوئی غیر معمولی بات ہے تو صرف یہ کہ جن چیزوں کو اور لوگ پوشیدہ رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی پارسائی کی جھوٹی نمائش کر کے دنیا کو فریب دیتے ہیں، اُن کو ایک والیِ ملک خود طشت از بام کر دینے کی جرأت رکھتا ہے اور اپنی اس سچائی اور بے ریائی سے رعایا کے دل موہ لیتا ہے۔

عشق و محبت کی انھیں داستانوں میں شرافتِ نفس، پاسِ حسب، اطاعتِ والدین، خدا ترسی، رحم و کرم، عدل و انصاف کے مظاہرے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اُن کو نظر انداز کرنا صورتِ حال کی ایک رخی تصویر پیش کر کے دنیا کو مغالطے میں ڈالنا ہے۔

اس کتاب میں موضوعِ کتاب کے علاوہ دوسری چیزوں کی تلاش کرنا مصنف کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ اور کسی کی کتابِ زندگی کے ایک باب کو پوری زندگی قرار دینا اس سے بڑی نا انصافی ہے۔

واجد علی شاہ امورِ سلطنت بھی انجام دیتے تھے، اہم مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے۔ وہ شاعر تھے، مصنف تھے، مختلف موضوعوں پر انھوں نے نظم و نثر فارسی اور اردو میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، جن میں اُن کے کئی ضخیم دیوان، کئی طویل مثنویاں، اور کئی جلدیں مرثیوں کی بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ساٹھ ستر کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

واجد علی شاہ نے اپنی عشق و محبت کی داستانیں فارسی نثر میں جس کتاب میں لکھی ہیں، اُس کے دو قلمی نسخے میں نے دیکھے ہیں، ایک وہ جس کا اردو ترجمہ مرزا فدا علی خنجر نے محل خانۂ شاہی کے نام سے شایع کیا اور دوسرا وہ جس کی ایک خوش خط نقل میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہی دوسرا نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، اور اس مضمون میں جابجا اسی کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ ان دونوں نسخوں میں کہیں کہیں اختلاف ہے۔

مرزا فدا علی نے اصل فارسی کتاب کا نام "تاریخ پری خانہ" بتایا ہے، مگر یہ نام اس کے دونوں قلمی نسخوں میں سے کسی میں درج نہیں ہے۔ محل خانۂ شاہی کے آخر میں حسبِ ذیل دو قطعۂ تاریخ ہیں:

چوں کتاب عشق نامہ شد تمام
کردمش تالیف خود با دوستے
گفتم اختر مصرع تاریخ آں
کردم از احوال نسواں فہرستے
۱۲۶۵ھ

در الف و دو صد بہ شصت و پنج
ز ذیقعدہ آمدہ وجود بصورت
بتاریخ ایں گفتہ مصرعے اختر
از احوال نسواں کردیم فہرست
۱۲۶۵ھ

ان قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام عشق نامہ ہے اور یہ ۱۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۵ھ کو تمام ہوئی۔ یہ دونوں قطعے فارسی قلمی نسخے میں بھی ہیں اور ایک تیسرا قطعہ اور ہے جو درج ذیل ہے۔

چو از حال کردار ان شد فراغ
کشودم بہ شکر الٰہی زبان
نوشتم سال تاریخ اختر نمود
"بیان حال کید عظیم زنان"
۱۲۶۵ھ

محل خانۂ شاہی میں ایک سو ستائیس[۱۲۷] بیان اور عشق نامۂ فارسی میں ایک سو بتیس[۱۳۲] داستانیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں اور اختلافات بھی ہیں۔ دونوں کی آخری داستان یا بیان میں ایک ایسے سانحے کا ذکر ملتا ہے جو ۱۹ ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۵ھ کو پیش آیا، جب کہ کتاب ۱۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۵ھ کو ختم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ کتاب ختم ہونے کے بعد بڑھا دیا گیا ہے۔

محل خانۂ شاہی کے تین مطبوعہ ایڈیشن میں نے دیکھے ہیں۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۴ء میں جی۔ پی ورما برادران پریس، لکھنؤ میں ۲۲×۱۸ سائز پر چھپا تھا۔ اس کے بعد دو ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر نامی پریس، لکھنؤ میں چھپے، پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء میں، دوسرا سنہ ۱۹۳۲ء میں۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے ایڈیشن کی ابتدا میں "ڈیڈیکیشن" کے عنوان سے ایک صفحے کی عبارت ہے، جس میں کتاب لکھنؤ کے ایک معزز رئیس یوسف حسین خاں بیرسٹر کے نام معنون کی گئی ہے، اور کتاب کے آخر میں دو صفحوں میں مقدمۂ کتاب شہزادہ مرزا محمد انجم قدر انجم لکھنوی کے قلم سے ہے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ دونوں تحریریں شائع نہیں کی گئی ہیں۔

محل خانۂ شاہی کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن میرے کتب خانے میں

موجود ہے۔

محل خانۂ شاہی اور مثنوی عشق نامہ دونوں واجد علی شاہ کے عشق نامۂ فارسی کے ترجمے ہیں۔ اس لیے اُن کے مصنف واجد علی شاہ ہی قرار پائیں گے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کے اخبار ہماری زبان میں فاضل لکھنوی کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے، جو خواجہ اسد تغلق کی روایت پر مبنی بتایا گیا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مثنوی عشق نامہ واجد علی شاہ کے حکم سے اسیر لکھنوی نے لکھی۔ اور اس بیان کی بناء پر یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اس مثنوی کو واجد علی شاہ سے منسوب کرنا بڑی غلطی اور اسیر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ لیکن یہ فیصلہ کرتے وقت یہ حقیقت نظر انداز کر دی گئی کہ اگر بالفرض فاضل کا بیان صحیح بھی ہو تو اسیر کی حیثیت ایک مترجم کی قرار پائے گی۔ کسی کتاب کا ترجمہ خواہ نثر میں ہو خواہ نظم میں، ترجمہ کرنے والا کتاب کا مصنف نہیں مانا جا سکتا۔ اس طرح مثنوی عشق نامہ کو اگر اسیر نے نظم کیا ہو تو واجد علی شاہ ہی اس کے مصنف ٹھہریں گے اور اسیر کو اس کا مصنف کہنا صحیح نہ ہوگا۔

اسیر اپنی مثنوی معارج الفضائل میں لکھتے ہیں:-

وہ واجد علی شاہ صاحب سریر
کہ ہے سلطنت جس سے رونق پذیر
کیا خلق مجھ شخص ناچیز سے
بلایا مجھے پاس تمیز سے
عنایت ہوئی مجھ کو ایسی کتاب
کہ تھی فی الحقیقت گل انتخاب
کیا نظم میں نے ہوئے شاد شاد
مجھے بھی تو ان کی خوشی ہے مراد

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسیر نے واجد علی شاہ کے حکم سے کسی کتاب کو نظم کیا۔ ممکن ہے کہ وہ کتاب یہی عشق نامہ ہو۔

عشق نامۂ فارسی کا اردو نثر میں دوسرا ترجمہ تحسین سروری نے "پری خانہ" کے نام سے کیا جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں کراچی سے اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۳ء میں رام پور سے شایع ہوا۔ یہ دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ اس میں محل خانۂ شاہی کا بیان ننانوے دو حصوں میں تقسیم کر کے اُن پر نمبر ۹۹ اور ۱۰۰ ڈال دیے گئے ہیں۔ یہ ایک نمبر کا فرق آخر تک چلا گیا ہے۔ اس طرح محل خانۂ شاہی کے آخری بیان کا نمبر جو ۱۲۷ تھا وہ پری خانہ میں ۱۲۸ ہو گیا ہے۔ حقیقتاً پری خانہ میں کوئی بیان زاید نہیں ہے۔

عشق نامۂ فارسی کی مختصر تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ نے یہ کتاب چھبیس برس کی عمر میں لکھی تھی اور اُس کے منظوم اُردو ترجمے کے مختلف نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مدت کے بعد اُس مدت میں پیش آنے والے واقعات کا اُس میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ منظوم ترجمے کے چار قلمی نسخے میں نے دیکھے ہیں۔ ایک نسخہ جو غالباً عشق نامے کے ابتدائی متن کا ترجمہ تھا۔ اس سے شروع کے دو صفحے مدت ہوئی میں نے نقل کر لیے تھے، لیکن اس کی تاریخ تصنیف وغیرہ اب یاد نہیں ہے۔ دوسرا ناقص الاول، بوسیدہ اور کرم خوردہ نسخہ ہے، جو اب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نسخے میں پہلے ورق کے بعد ایک ورق کا زیادہ حصہ اور چھ ورق پورے غائب ہیں۔ اس میں داستانوں کی تعداد ایک سو تینتیس ہے۔ آخری داستان کا عنوان اور ابتدائی دو تین شعر نہیں ہیں۔ آخری دو شعر یہ ہیں:-

یہ ہے سال ہجری دم اختتام
کیا عشق نسواں کو نامہ تمام
ہوا جب کہ مد نظر خاتمہ
کہی دل نے تاریخ "کر خاتمہ"

پہلے شعر کا دوسرا مصرع اور دوسرے شعر میں "کر خاتمہ" مادہ تاریخ ہیں، جن کے عدد ۱۲۶۶ ہیں، یعنی یہ کتاب ۱۲۶۶ھ میں تمام ہوئی۔ عشق نامۂ منظوم کا تیسرا نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں شروع کی پچیس داستانیں غائب ہیں اور چھبیسویں داستان کے صرف آخری دس شعر موجود ہیں۔ اس کے بعد ستائیسویں سے ایک سو اٹھتیسویں داستان تک ہیں۔ آخری داستان کے ایک سو سولہ شعر موجود ہیں، لیکن داستان ابھی تمام نہیں ہوئی ہے۔ چوتھا قلمی نسخہ خوش خط اور مطلا تھا، لیکن اس کے شروع، آخر اور درمیان کے بہت بہت سے ورق کم تھے۔ اس ناتمام نسخے میں آخری داستان کا نمبر ۱۸۵ اور آخری سن ۱۲۷۰ تھا۔ واجد علی شاہ ۲۶ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ (۴ر فروری ۱۸۵۶ء) تک اودھ کے بادشاہ رہے۔ اس لیے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نسخے میں ان کی بادشاہی کے خاتمے تک کا حال درج ہوگا اور یہ اس کتاب کا مکمل نسخہ ہوگا۔

عشق نامۂ منظوم کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی مجھ کو ملا، جو شروع سے تھوڑا اور آخر سے بہت کم تھا۔ پھر اس کا ایک دوسرا نسخہ نظر آیا جو اس سے بہت زیادہ ناقص تھا۔ غالباً یہی نسخہ بعد کو بھوپال پہنچ گیا۔ یہ دونوں نسخے شروع اور آخر سے ناقص تھے۔ اس لیے مطبع کا نام اُن میں درج نہیں تھا، مگر کتابت اور طباعت کی شان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مطبع سلطانی میں چھپے تھے۔

اس منظوم کتاب کے قلمی اور مطبوعہ جن نسخوں کا ذکر بیان کیا گیا ہے، ان میں سے کسی نسخے میں اس کا نام درج نہیں ہے۔ امیر علی خاں ہلال نے اپنی کتاب وزیر نامہ میں واجد علی شاہ کی تصنیفات میں سے ایک کا نام "عشق نامۂ مبارک" بتایا ہے اور اس کے ستر شعر نقل کیے ہیں[1]۔ یہ سب شعر اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس طرح

(باقی صفحہ ۹ پر)

۱۔ وزیر نامہ، مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۹۳ھ، صفحہ ۲۱۲-۲۱۳

خاکِ محترم

تاراچند پاھی

(انڈیا گیٹ دہلی سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

دمن ہے کوہسار ہے ۔ چمن ہے لالہ زار ہے
یہ رنگ و بوئے دلکشیں ۔ جواں جواں حسیں حسیں
نمود لاجواب ہے ۔ سبو ہے ماہتاب ہے
ہجوم گل تمام تر ۔ محیط کائنات پر
صبا حسیں فضائیں ہیں ۔ لطافتیں ہوائیں ہیں
کنول ہے موج آب میں ۔ کہ عکس ہے شراب میں
سجی سجائی کشتیاں ۔ ادھر ادھر رواں دواں
گیاہ سبز دشت پر ۔ ہیں مسکراتے پھول جلوہ گر
فضائیں عطر بیز ہیں ۔ ہوائیں عشق خیز ہیں
چمک رہی ہے چاندنی ۔ دمک رہی ہے زندگی
فسوں ہے موج آب پر ۔ حیات ہے شباب پر
میں سوچتا ہوں ہم نشیں ۔ کہ یہ حسین سرزمیں
چمن بہ دوش و گلفشاں ۔ جواب باغ و کہکشاں
اسی طرح حسیں رہے ۔ جمیل و مہ جبیں رہے
رواں رہیں گل و سمن ۔ ہمالیہ سے تا چمن
چمن سے تا بہ کنیا ۔ رہے گلوں کا سلسلہ
شگفتہ جان و دل رہیں ۔ بہاریں مستقل رہیں
بہار جھولیاں بھرے ۔ خزاں ادھر نہ رخ کرے
پڑیں نہ غیر کے قدم ۔ ہے یہ خاکِ محترم

سکوتِ شب

سید فضل المتین

سکوتِ شب میں اکثر مجھ پہ یہ عالم گزرتا ہے
تو میرے روبرو ہے تجھ سے محو گفتگو ہوں میں
تری سانسوں کی آہٹ، تیرے دل کی دھڑکنیں مجھ سے
مخاطب ہیں

میں کھویا ہوں
نشیلی سرمگیں آنکھوں کی مستی میں
سنہرے عارضِ تاباں کی گرمی میں
معطر ریشمی زلفوں کی خوشبو میں

سکوتِ شب
مرا سرمایۂ ہستی
مرے خوابوں کی بستی ہے

تلوک چند محروم کی مختصر سوانح

جناب محروم ۱۸۸۵ء میں مغربی پاکستان میں ضلع عیسیٰ خیل میں میانوالی کے مقام پر پیدا ہوئے ملک کی تقسیم کے بعد وہ بھارت آ گئے اور دہلی میں بس گئے۔

مرحوم ڈاکٹر محمد اقبال، اکبر الہ آبادی، سر عبدالقادر اور لالہ لاجپت رائے ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کے ہم عصر تھے بھارت اور پاکستان دونوں جگہ ان کی بڑی عزت تھی مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ نصف صدی سے زیادہ دنیائے ادب پر چھائے رہے۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں ان میں "گنج معانی" "رباعیات محروم" "کاروان وطن" "بہار طفلی" "نیرنگ معانی" اور "شعلۂ نوا" شامل ہیں عکس جمیل اور دو اور تصنیفات زیر طباعت ہیں ان میں سے ایک کتاب ان کی فارسی نظموں کا مجموعہ ہے۔

غزلوں اور نظموں کے علاوہ ان کا بہت سا کلام حب الوطنی کے موضوع پر ہے وہ اپنی ان نظموں کے لیے بہت مشہور ہیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں اس سال ان کی ایک کتاب "بچوں کی دنیا" پر وزارت تعلیم نے ایک ہزار روپے انعام دیا ہے۔

موصوف ایک مخلص معلم تھے وہ مغربی پاکستان اور دہلی کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں پڑھاتے رہے ہیں۔ محروم صاحب پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی سے اردو اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے وہ دہلی کے روزنامہ تیج کے ہفتہ روزہ ایڈیشن کی ادارت کے فرائض بھی سر انجام دیتے رہے ہیں۔

جناب تلوک چند محروم کی وطنی، ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پنجاب نے سنہ ۱۹۶۲ء میں انھیں گیارہ سو روپے کی تھیلی خلعت اعزاز اور ایک سپاس نامہ پیش کیا۔

محروم صاحب کے سوگواروں میں ان کی بیوہ ان کے صاحب زادے جناب جگن ناتھ آزاد دو بیٹیاں اور بھارت پاکستان میں ان کے بیشمار مداح اور عقیدت مند شامل ہیں۔

جناب محروم نے بڑے بڑے بزرگانِ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے اکبر الہ آبادی نے ان کے کلام سے متاثر ہو کر انھیں ایک بار لکھا تھا۔ ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظروں کی ہے بجا ملک میں دھوم

معلوم ہوا کہ اس منظوم کتاب یا مثنوی کا نام بھی عشق نامہ ہے۔ مثنوی عشق نامہ کے قلمی اور مطبوعہ ناقص نسخے جو مجھ کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے ان کی مدد سے میں اس مثنوی کی تکمیل کرتا رہا۔ ان نسخوں کی نقل اور مقابلہ کئی سال ہوتا رہا اور ایک ایسا نسخہ تیار ہو گیا جس میں داستانوں کی تعداد ایک سو پچاسی تک پہنچ گئی، مگر مثنوی اب بھی ناتمام ہے[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً عشق نامہ اس مقام پر ختم کر دیا گیا تھا جہاں اس کی تصنیف کا مقصد یا ماحصل بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں یہ مقام عشق نامۂ فارسی[2]، محل خانۂ شاہی[3]، پری خانہ[4] اور مثنوی عشق نامہ کے اس قلمی نسخے سے پیش کیا جاتا ہے، جو میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

"امید آں دارم کہ ازیں بے وفائی نامہ ہر کہ ملاحظہ سازد دل خود را از محبت نسوان باز دارد و زر خود را در مقدمۂ اینہا بہ معرض تلف نیارد چرا کہ انجام کار اینہا آنچہ می شود بد است۔ ایشایان اگر حضرت یوسف را ہم یابند از بے وفائی خود دست بر ندارند لہٰذا از ایشان کنارہ کردن بسیار خوب است۔۔۔۔ آنچہ من بادشاہ خوب صورت و سیرت را کہ کتب ہا در صفت و ثنائے من مخوانند باوجود اطاعت نہ ترسیدند پس بہ دیگرے چہ خواہد رسید۔"

"امیدوار ہوں یہ بے وفائی نامہ جو کوئی ملاحظہ فرمائے عورتوں کی صحبت سے باز رہے اور اپنا روپیہ ان میں تلف نہ کرے۔ کیونکہ اس کا جو انجام ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ لوگ اگر حضرت یوسف کو بھی پائیں تو اپنی بے وفائی سے (ہاتھ نہ) اٹھائیں۔ لہٰذا ان لوگوں سے کنارہ کرنا بہت اچھا ہے۔ مجھ سے بادشاہ خوب صورت و خوب سیرت کے ساتھ جس کی صفت و ثنا میں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ باوجود اطاعت نہ ڈریں تو دوسروں کو ان سے کیا امید ہو سکتی ہے۔"

"متوقع ہوں کہ جو کوئی بھی یہ بے وفائی نامہ ملاحظہ کرے گا وہ عورتوں کی محبت سے گریز کرے گا۔ اپنا روپیہ ان پر برباد نہ کرے گا۔ کیونکہ اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ ان عورتوں کو اگر حضرت یوسف بھی مل جائیں تو اپنی بے وفائی نہ چھوڑیں۔ اس لیے ان سے دور رہنا ہی مناسب ہے۔ مجھ جیسے بادشاہ صورت و سیرت میں یکتا جس کی تعریف میں کتابیں لکھی گئی ہیں، باوجود ناز برداریوں کے کچھ خوف نہ کریں تو دوسروں کے ساتھ کیا نہ کریں گی[5]۔"

لکھی ہے جو میں نے یہ بہتر کتاب
مضامین اس کے ہیں سب انتخاب
نہیں جھوٹ کا نام اس میں زرا
جو گزرا تھا سب بے تکلف لکھا
کریں چشم عبرت سے عاقل نظر
خبر شرط ہے میں نے کر دی خبر
نہیں ہے فقط نقد درد و داغ
یہ ہے راہ بھولے ہوؤں کو چراغ
اسے دیدۂ غور سے جو شیال
نہ اس دام میں پھنس کے کھینچے ملال
نہ جنبش کرے ان کی تحریک سے
رہے دور دور ان کے نزدیک سے
کرو غور مجھ سا جوان حسین
جہاں بادشہ زیب تاج و نگیں
مسلسل کرم بخشش متصل
کہ دشمن نہیں مجھ سے آزردہ دل
جو مجھ سے ہے یہ بے وفاؤں کا حال
نہ میرا ادب ہے نہ اپنا خیال
کرو بے وفائی نظر غور سے
وفا کیا کریں گی کسی اور سے
سخن مختصر جو یہ دیکھے کتاب
کہ اس میں کشادہ ہیں عبرت کے باب
کنارہ کرے ان سے ہر حال میں
پھنسے خود نہ زلفوں کے جنجال میں
تلف مال ان کے لیے کیوں کرے
تبہ حال ان کے لیے کیوں کرے[6]

واجد علی شاہ نے عشق نامہ ابتداءً چھبیس برس کی عمر میں لکھا

---

[1] جس بات کے لیے اس نسخے کی تکمیل میں دقّی محنت کی گئی اور اتنا وقت صرف کیا گیا وہ کام جب تک انجام نہ پا جائے گا اس وقت تک یہ نسخہ منظر عام پر نہ آئے گا۔

[2] عشق نامۂ فارسی قلمی داستان صد و بست و نہم ص ۲۱۶

[3] محل خانۂ شاہی بیان ایک سو چھبیس ص ۱۵۵، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء

[4] پری خانہ دہلی پرنٹنگ پریس رام پور، ۱۹۶۵ء نمبر ۱۲۵ ص ۱۸۳

[5] مثنوی عشق نامہ قلمی مملوکۂ راقم، داستان یک صد و سی و یکم ص ۲۲۷ — ۲۲۹

تھا اور اس میں آٹھ برس کے سن سے چھبیس برس کی عمر تک اٹھارہ سال کی عشق و محبت کی داستانیں بیان کی تھیں۔ اُس کی ایسی ابتدائی صورت کا ترجمہ محل خانۂ شاہی اور پری خانہ کے ناموں سے شایع ہوا ہے۔ ان داستانوں کو پڑھتے وقت جو واقعات پے در پے سامنے آتے ہیں، ان سے سطحی نظریں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ واجد علی شاہ کو عشق بازی اور عیش کوشی کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ یہ حقیقت نظر انداز ہو جاتی ہے کہ یہ واقعات اٹھارہ سال کی طویل مدت میں پیش آئے اور اُن کے بیچ بیچ میں طولانی وقفے ہوئے، جو مختلف انسانی ضروریات اور شاہانہ فرائض کی انجام دہی میں گزرے۔ لیکن اُن ضروریات اور فرائض کا بیان کتاب کے موضوع سے خارج تھا، اس لیے اُن کا ذکر کر کے خلطِ مباحث کا ارتکاب نہیں کیا گیا اور بیان کے تسلسل میں خلل واقع نہیں ہونے دیا گیا۔

تحسین سروری نے پری خانے کے دیباچے میں بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے عام غلط فہمیوں کا پتا چلتا ہے۔ ہم ذیل میں ان کے بیانات نقل کر کے ان کے بارے میں اظہارِ خیال کریں گے۔

> ۱۔ "اس کتاب کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جنسی مریض کی داستانِ ہجر و وصال ہے، جو بادشاہ ہونے کے باوجود حالات و خواہشات کا غلام اور ایک مجبور و بے بس انسان ہے۔ یہ ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ایک تخت و تاج کے مالک کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔"

اس سلسلے میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب بادشاہی اور فرماں روائی کی داستان نہیں ہے۔ بقول ہجر و وصال کی داستان ہے۔ اگر واجد علی شاہ معاملاتِ عشق میں اپنے شاہی اختیارات سے کام لینے لگتے تو یہ ہجر و وصال کی داستان نہ رہتی جبر و تشدد کی داستان بن جاتی۔

> ۲۔ "شاہ اودھ کی بیگمات و محلات کی ایک بڑی تعداد ہے اور اُن کے القاب و خطابات بھی اتنے پرشکوہ ہیں کہ وہ معزز و ممتاز خاندانوں کی خواتین معلوم ہوتی ہیں۔"

بیگم کے لفظ اور بیگمات کے خطابوں سے اُن کے خاندانی اعزاز و امتیاز کا اظہار مقصود نہ تھا۔ واجد علی شاہ نے تقریباً تمام بیگموں کے بارے میں خود لکھ دیا ہے کہ وہ کن طبقوں اور کن خاندانوں سے ہیں، اور یہ طبقے اور خاندان ایسے ہیں جن کو کوئی اعزاز و امتیاز حاصل نہ تھا۔ ان کے شاندار خطاب فقط بادشاہ اور شاہی محل سے اُن کا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا شرر لکھنوی کا چشم دید بیان ہے کہ شاہی محل کی بعض ملک نواب آب رسان بیگم تھی اور اور مہترانی نواب مصفّا بیگم[1]

> ۳۔ "یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُن میں زیادہ تر اپنی سابقہ زندگی میں شاہدانِ بازاری تھیں۔"

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عورتیں جو بیگمیں کہلاتی تھیں، گانے ناچنے کی خدمت پر ملازم رکھی گئی تھیں اور اس لیے انھیں طبقوں سے لی گئی تھیں جن کا کام ہی ناچنا گانا تھا۔

آخر میں مثنوی خاقانِ سرور کا ذکر بھی ضروری ہے، جو واجد علی شاہ کی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ یہ کوئی نئی مثنوی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مثنوی عشق نامہ سے ادھر اُدھر کی چند داستانیں لے کر ان کا بے ربط مجموعہ "خاقانِ سرور" کے بے ڈھنگے نام سے مرتب کر کے مطبع گلشن فیض، لکھنؤ میں چھپوا کر شایع کر دیا گیا۔ اس کی ترتیب اور طباعت کا سال ۱۳۱۷ھ ہے اور اس کے مرتب اور ناشر خواجہ محمد ولی جان عاصی ہیں۔ یہ بہت کم استعداد اور بد سلیقہ شخص تھے۔ کتاب کے صفحات ۲ و ۳ و ۲۲ پر نثر کی جو عبارتیں انھوں نے لکھی ہیں، ان میں سے ایک بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ صفحہ ۵ پر قطب علی خاں کے حال کے درمیان میں بالکل بے محل یہ شعر داخل کر دیا ہے:

سخن مختصر تو دا کبر و عز و ر
رکھا نام مثنوی خاقانِ سرور

یہ شعر بے معنی اور اس کا دوسرا مصرع ناموزوں ہے۔

صفحہ ۳۱ پر یہ شعر عنوان کے طور پر جلی حرفوں میں لکھا گیا ہے:

کرے کلک شکر و حمد فتاح
کہ ہے وہ خالق معمار ارواح

یہ شعر بھی مہمل ہے اور اس کا پہلا مصرع ناموزوں بھی ہے۔

اس عنوان کے تحت میں شکر و حمد کے اشعار ہونا چاہیے تھے۔ لیکن ہے کیا؟ صفحہ ۲ پر جو پانچ شعر لکھے گئے ہیں اور اُن میں جو عشق کا بیان شروع کیا گیا تھا، اُسی سلسلے کے یہ بقیہ تیرہ شعر ہیں، جن کو نہ شکر سے کوئی نسبت ہے نہ حمد سے۔

---

[1] مثنوی حزنِ اختر مصنفہ واجد علی شاہ شایع کردہ دائرۂ ادبیہ، لکھنؤ ۱۹۲۲ء، مقدمہ صفحہ ۱۔

مراسلات

ایک نادر مخطوطہ

میرے کرم فرما پیرجی منشی محمد صلاح الدین صاحب عشقی فاروقی ساکن قصبہ آلیجھنوں (شیخاواٹی) کلرک وقف بورڈ راجستھان نے مجھ سے ذکر کیا کہ بزرگوں کے زمانے کی ایک قلمی کتاب بزبان فارسی میرے پاس ہے جس میں بزرگان دین کے حالات ہیں کبھی اُسے دیکھئے گا کیا ہے۔ نارنول کے متعلق معلوم ہوتی ہے لہٰذا میں اُن کے دولتخانہ پر حاضر ہوا تو موصوف نے ایک انگریزی اخبار میں لپٹا ہوا ایک پلندہ مجھے عنایت کیا۔ دیکھا تو کتاب کے تمام اوراق نمی کے اثر سے بے ترتیبی کے ساتھ چپک کر ایک سات آٹھ انچ موٹی دفتی یا وصلی بن گئی ہے۔ بعض اوراق بیحد بوسیدہ و دریدہ اس قدر کمزور ہیں کہ ہاتھ لگانے سے بکس جاتے ہیں۔ محفوظ اوراق سطبوطی سے چپک گئے ہیں۔ کاغذ عمدہ مضبوط کشمیری حنائی ہے۔ بہت سے ورق اب بھی مضبوط ہیں۔ خط اوسط درجہ کا نستعلیق و واضح ہے۔ مگر بہت پختہ اور اصول خطاطی کے عین مطابق۔ سائز ۱۰×$8\frac{1}{2}$ مسطر ۱۹ سطر۔ یہ نہایت پختہ روشنائی سے تحریر شدہ جو نہ کہیں سے پھیلی ہے نہ پھوٹی ہے البتہ چپک خوب گئی ہے۔ عنوانات شنگرفی روشنائی سے تحریر ہیں جو بہت پھیکی پڑ گئی ہے۔ مگر درمیانی اوراق کی بدستور تیز ہے۔ چپکے ہوئے ورقوں میں پھپھوندی اس قدر لگ گئی ہے کہ اس کی سیاہی نے عبارت کو چھپا دیا ہے۔ مگر کپڑے سے باحتیاط صاف کرنے پر وہ صاف ہو گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد تیاری کتاب کے اوراق پریشان ہو گئے اس لیے اس کی جزو بندی کا غذ چسپاں کر کی گئی۔ مگر یہ کاغذ نہایت خراب دیسی شکل جاذب تھا جس پر نمی کا اثر بہت ہوا وہ خود تو بالکل بیکار ہو ہی گیا مگر کتاب کو بھی خراب کر دیا۔ البتہ اجزا کی سلائی کا ڈورہ بالکل مضبوط ہے۔ دیمک سے یہ مخطوطہ محفوظ ہے اور اوراق پر نمبر شمار بھی ہے (صفحات پر نہیں) "ترک" بھی درج ہیں۔ آخری ورق نمبر موجودہ حالت میں ۵۳۹ ہے گویا ۱۰۷۸ صفحات۔

میں نے پورے ستائیس دن کئی کئی گھنٹہ محنت کر کے اس کے ورق کھولے صاف کیے اور حسب ضرورت چسپاں کر درست بعض تو اس قدر چپک گئے تھے کہ دو ورق علیحدہ کرنے میں دو دو گھنٹے لگ گئے۔ تاہم موجودہ تمام اوراق مرتب کیے گئے تو حسب ذیل کم نکلے از نمبر ۱ تا ۹، و ۱۳، و از ۲۱ تا ۲۳، و از ۶۹ تا ۷۲ و از ۱۰۴ تا ۱۱۹۔ و از ۲۰۵ تا ۲۰۸، و از ۳۴۹ تا ۴۱۷ اور ورق نمبر ۵۳۹ کے بعد کے ورق جو اغلباً آٹھ دس سے زیادہ نہ ہوں گے کیونکہ فہرست میں آخری عنوان "مناجات بحضرت قاضی الحاجات حق سبحانہ تعالیٰ شانہ" ملتا ہے اور اسی پر کتاب ختم ہے۔

زبان نہایت آسان و شستہ ہے اور انداز بیان مختصر و جامع اور برجستہ کتاب کا نام ثنار اللابرار ہے اور اس کے مولف مولوی شیخ محمد ثنار اللہ فاروقی نارنولی ابوالفتح شاہی ہیں ان کا مختصر حال اب سے تینتیس سال قبل میں نے اپنی تالیف "نقیرا" ۱۳۵۲ھ مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ میں حسب ذیل درج کیا تھا۔

"مولوی محمد ثنار اللہ صاحب "ثنائے ترکمانی" آپ حضرت شاہ ابوالفتح نارنولی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ ہیں اور صاحب تصانیف متعددہ۔ علم ظاہر و باطن سے آراستہ اور خاص نارنول کے باشندہ تھے۔ جناب میاں محمد ابراہیم صاحب نظامی النظامی نارنولی نے آپ کا حسب ذیل شجرہ رقم فرما کر بھیجا ہے ثنار اللہ بن شیخ محمد خلیل اللہ بن حافظ فضل اللہ بن حافظ عبد الصمد بن حافظ عبد الوہاب الفاروقی الخطیب نارنولی رحمتہ اللہ علیہم۔ افسوس کہ آپ کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے حالانکہ آپ نے ہزارہا بزرگان دین کے حالات میں متعدد تالیفات چھوڑی ہیں جو سب قلمی ہیں۔ ۱۲ مولف صفحہ ۱۱۳

اور ان کے پیر حضرت بندگی شاہ ابوالفتح کا حال میرے والد مرحوم مولوی محمد احتشام الدین شوکت عثمانی نارنولی نے اپنی تالیف تاریخ ملیم ۱۳۲۶ھ کے صفحہ ۱۸۷ تا ۱۹۱ پر درج کیا ہے۔ شاہ صاحب موصوف کا سنہ وصال بروئے "ثنائے ترکمانی" ۲۸ر رمضان ۱۱۸۵ھ ہے یہی زمانہ مولوی ثنار اللہ مولف کتاب ہذا کا ہے لہٰذا بلاشک یہ تقریباً دو سو سال قبل کی تالیف ہے۔ اور اغلباً یہ نسخہ خود مولف کا قلمی ہے اس لیے کہ اس کی ایک دوسری تالیف "ثنائے ترکمانی" اسی خط اور اسی روشنائی پر تحریر شدہ قلمی مولوی صاحب موصوف مولف ہذا میری نظر میں ہے۔ جس کا یہی کاغذ اور یہی سائز ہے۔

مخطوطہ کے شروع میں دو فہرست ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اس میں چھتیس مقالات ہیں۔ پہلی فہرست میں اسمائے مذکورین مقالہ وار ہیں جو ورق نمبر ۱ سے شروع ہو کر ورق نمبر ۳ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے اوراق نمبری ایک (۱) تا نو (۹) غائب ہیں جن پر مقالہ اول تا پنجم کی فہرست تھی اس لیے مقالہ ششم میں درج شدہ نام ہی معلوم ہو سکے جس کا آغاز اس طرح ہے۔

مقالہ ششم (سرخی سے)

۱۱۰	۱۱۱
خواجہ ابراہیم ادہم	ابو عبد اللہ مغربی
از فضیل عیاض	از ابوالحسن زرین

۱۱۱

ابو یعقوب نہر جوری ایضاً

از ابو یعقوب موسی

پھر اسی فہرست کے اوراق نمبر ۱۳، ۲۱-۲۲ اور ۲۳ بھی غائب ہیں۔ دوسری فہرست بترتیب حروف تہجی ہے یعنی اس میں مذکورین کے نام ردیف وار درج کیے گئے ہیں یہ فہرست ورق ۳۱ سے شروع ہو کر ۶۸ پر ختم ہوئی ہے اور مکمل ہے۔ کتاب

کا آغاز ورق ۹۹ سے ہوا ہے۔ اور پہلا ذکر سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورق نمبر ۱ سے شروع کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر کہ ورق ۹۹ سے ۰ تک حمد و نعت و منقبت ہیں جن میں! لیف نام اور سنہ تالیف ہوگا۔ اسی فہرست سے ظاہر ہوا کہ اس تالیف میں اٹھارہ سو اکتالیس بزرگان دین کے حالات ہیں۔ جن میں خلفائے راشدین، امہات المومنین، اصحاب، تابعین، ائمۂ اہل بیت، اور ائمۂ شریعت شامل ہیں، درمیانی اوراق جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اُن پر درج شدہ اسمائے بزرگان دین کا پتہ اسی فہرست سے چلا لیا گیا۔ جو اس مخطوط میں میں نے لکھ کر شامل کر دیے ہیں۔

میرے خیال سے یہ مخطوط اس لیے نادر ہے کہ اس میں مولف نے اپنے زمانے تک کے ایسے گمنام بزرگوں کے بھی حالات درج کیے ہیں جو دوسری کتب سیر میں نہیں ملتے۔ دوم خود مولف کا قلمی ہے اس لیے الحاق و اغلاط سے پاک ہے۔ بظاہر یہ وہی نسخہ معلوم ہوتا ہے جو بندگی شاہ نظام نارنولی کے خاندان میں بطور تبرک محفوظ تھا۔ جس کو امتداد زمانہ نے اس حالت کو پہنچا دیا۔ یہ امر بھی بالکل ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور نسخہ نہ ہو۔ تاہم اگر کسی صاحب کے پاس اس کی نقل ہو اور وہ از راہ کرم مجھے مطلع فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ کیونکہ اگر کوئی اور نسخہ دریافت ہوا تو میرا ارادہ ہے کہ بشرط حیات اس کو اس سے مکمل کر لوں اسی لیے ضائع شدہ اوراق کی جگہ میں نے ورق مع نمبر شمار لگا دیے ہیں۔ اس تکمیل کے ارادہ کی غرض صرف یہ ہے کہ

چوں بخیر گذرم یاد رفتگاں خواہم
کہ رسند در اہم بخیر یاد کنند

اس نسخہ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جابجا بزرگوں کے حالات کے ساتھ ان کے عہد کے بادشاہ کا نام بھی حاشیہ پر لکھ دیا ہے یہ حوالے کسی اور صاحب نے درج کیے ہیں جس کا اظہار خط سے ہوتا ہے جو اصل نسخہ کے خط سے مختلف ہے۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی۔

میں اپنا پتہ بھی درج کر رہا ہوں تاکہ اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں خط و کتابت فرمائیں تو ان کو کوئی دقت نہ ہو۔

پتہ:-

احترام الدین احمد شاغل عثمانی الجمالی۔ تسلیم منزل، چوکرسی گھاٹ دروازہ۔

دفتر انجمن ترقی اردو راجستھان۔ جے پور

ایک استفسار کے جواب میں

"ہماری زبان" بابت ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۵ء میں جناب عابد کیفی صاحب نے دریافت فرمایا ہے کہ مندرجۂ ذیل شعر کی بحر بحر منسرح ہے یا بحر بسیط؟

فلسفۂ شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

جواباً عرض ہے کہ اس شعر کی بحر بحر منسرح بھی ہو سکتی ہے اور بحر بسیط بھی۔ بحر منسرح سالم کا وزن ہے مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات دو بار اگر مندرجۂ بالا شعر کی بحر کو بحر منسرح قرار دیا جائے تو ہم کہیں گے کہ اس کے پہلے رکن میں طے واقع ہوا ہے اور دوسرے میں طے اور کسف دونوں واقع ہوئے ہیں پہلے رکن مستفعلن میں زحاف طے کے واقع ہونے سے مستفعلن، مفتعلن ہو گیا اور دوسرے رکن مفعولات میں طے کے واقع ہونے سے واؤ گر پڑا، اور بہ سبب کسف کے ت گر پڑی۔ پس مفعلا رہا اور اس کو فاعلن سے بدل لیا۔ اس طرح شعر کی بحر کا نام ہوگا منسرح مطوی مکسوف۔

بحر بسیط سالم کا وزن ہے مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن دو بار اگر مندرجۂ بالا شعر کی بحر کو بحر بسیط قرار دیں تو ہم کہیں گے کہ اس کے پہلے رکن مستفعلن میں طے واقع ہوا ہے مستفعلن میں زحاف طے کے واقع ہونے سے مستفعلن مفتعلن ہو گیا، اور دوسرا رکن فاعلن جوں کا توں رہا۔ اس طرح بحر کا نام ہوگا۔ "بحر بسیط مثمن مطوی" شعر کی تقطیع یوں ہوگی۔

فلسفۂ د	شعر کی	اور حقی	قت ہے کیا
مفتعلن	فاعلن	مفتعلن	فاعلن
حرف تمن	نا جسے	کہہ نہ سکیں	روبرو
مفتعلن	فاعلن	مفتعلن	فاعلن

(سراج الحسن سراج ادیبی)

(۲)

"ہماری زبان" کے ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں عابد کیفی صاحب نے اس شعر سے

فلسفۂ شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

کی بحر کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ آیا یہ شعر بحر بسیط میں ہے یا بحر منسرح میں۔

عابد صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ شعر بحر منسرح مطوی مکسوف میں ہے جس کی تقطیع یوں ہوگی۔

فلسفۂ شعر کی اور حقیقت ہے کیا
مُفتَعِلُن، فَاعِلُن، مُفتَعِلُن، فَاعِلُن
حرف تمنا جسے، کہہ نہ سکیں روبرو
مُفتَعِلُن، فَاعِلُن، مُفتَعِلُن، فَاعِلُن

جبکہ بحر بسیط ہے سے
مستفعلن، فَاعِلُن، مستفعلن، فَاعِلُن

شفق تنویر (بھوپال)

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام اردو ہفتہ

اردو کو قانونی موقف دینے کا مطالبہ

انجمن کے پچھلے اجتماع منعقدہ ۱۲۵ دسمبر ۱۹۶۵ء میں طے پایا تھا کہ اسمبلی کی اگلی میقات میں سرکاری زبان کے بارے میں جو مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے اس تعلق سے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے ایک "اردو ہفتہ" منایا جائے تاکہ اس مسودہ قانون میں اردو کو بھی جگہ مل سکے۔

اس سلسلہ میں انجمن نے طے کیا ہے کہ یکم فروری ۱۹۶۶ء سے سات فروری ۱۹۶۶ء کے دوران میں "اردو ہفتہ" منایا جائے۔ ان سات دنوں کے دوران میں کسی بھی دن "یوم اردو" منعقد کرکے حسب ذیل قرارداد منظور کرکے نیچے درج کردہ اصحاب کے نام روانہ کی جائے۔ "یوم اردو" کے دن خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں تلگو بولنے والے بھائیوں کی بھی ہمیں ہمدردی حاصل ہوسکے اور وہ بھی ہمارے اس جائز مطالبے کی تائید کرسکیں۔

مسودہ قرارداد

"انجمن ترقی اردو کے اراکین اور ہمدردوں کا یہ جلسہ اس مسودہ قانون کا خیر مقدم کرتا ہے جو تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے اسمبلی کی آئندہ میقات میں پیش کیا جانے والا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک صحیح اقدام ہے جس کے روبہ عمل لانے میں اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جلسہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ اردو کے استعمال کے لیے بھی مجوزہ قانون ہی میں ضروری دفعات شامل کی جائیں۔ انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) نے اس تعلق سے جو نمائندگی ریاستی حکومت میں کی ہے اور اردو کو قانونی موقف دینے کے لیے مسودہ قانون میں جو ترمیمیں پیش کی ہیں ان کی بھی یہ جلسہ پرزور تائید کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ریاست میں اردو کے موقف کو قانونی طور پر محفوظ کردیا جائے۔"

قرارداد ان قائدین کے نام روانہ کی جائے

(۱) جناب کے۔ برہمانند ریڈی۔ وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش

(۲) جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ۔ وزیر قانون "

(۳) جناب بی۔ وی۔ سبا ریڈی۔ اسپیکر مجلس قانون ساز آندھرا

(۴) لسانیاتی اقلیتوں کے کمشنر۔ الہ آباد

(حبیب الرحمٰن معتمد اعزازی ریاستی شاخ آندھرا پردیش)

راجستھان کے اردو دوستوں سے اپیل

اردو دوستوں کو معلوم ہوگا کہ گورنمنٹ راجستھان نے اردو کے متعلق اپنے احکام کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک کمیٹی بنادی ہے جس کی پہلی میٹنگ ۲۷ر ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء کو ہوچکی ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں جہاں سے عدم تعمیل احکام کی شکایات انجمن کو وصول ہوئیں وہ گورنمنٹ کے نوٹس میں لائی گئیں اور مسلسل خط و کتابت جاری ہے۔ لیکن یقیناً عدم تعمیل احکام کی پوری اور جائز شکایات اب تک انجمن ہٰذا کو اردو دوستوں نے نہیں بھیجی ہیں۔ اس لیے اس کمیٹی کے ذریعہ اردو دوستوں سے عموماً اور اپنی مقامی شاخوں کے کارکنوں سے خصوصاً استدعا ہے کہ وہ بعد تحقیق واقعی اگر اپنی موجودہ مشکلات اور احکام گورنمنٹ کی عدم تعمیل بابت تعلیم اردو کے متعلق ۲۵ر جنوری سنہ ۱۹۶۶ء تک مفصل طور پر مع ثبوت انجمن ہٰذا کو مطلع کردیں تو انجمن کا ایک وفد ایجوکیشن منسٹر صاحب راجستھان سے مل کر ان پر توجہ دلائے اور برائے تعمیل احکام جاری کرائے۔ امید کہ اردو دوست اور متعلقہ اصحاب فوری اور پوری توجہ کریں گے۔

(احترام الدین احمد شاغل

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان)

آگرہ میں شام فراق

آگرہ ۲۰ر جنوری۔ جناب فراق گورکھپوری کی آمد کے سلسلے میں جناب ایس۔ این۔ نہا کے دولتکدہ پر شام فراق کا اہتمام کیا گیا۔

جناب میکش اکبرآبادی۔ جناب مغیث الدین فریدی (دہلی یونیورسٹی) اور جناب اعجاز صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر بمبئی) نے شرکت فرمائی۔

جناب اسرار اکبرآبادی۔ جناب معین فریدی۔ جناب صہبا اکبرآبادی جناب اصغر اکبرآبادی اور جناب خلش اکبرآبادی نے بھی بزم شعر خوانی میں حصہ لیا۔

شعر و شاعری کے علاوہ جناب فراق کے ادبی چٹکلوں اور اردو ادب پر پرمغز گفتگو نے جلسہ کی شان و شوکت کو بڑھایا۔

(معین فریدی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ آگرہ)

"ہماری زبان"

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

انجمن ترقی اردو (کلکتہ) کے وفد کی میئر اور کمشنر سے ملاقات

اردو اسکولوں کے متعلق امید افزا جملے

انجمن ترقی اردو (کلکتہ) کا ایک وفد آج بتاریخ ۲۸ ردسمبر کلکتہ کارپوریشن کے میئر اور کمشنر سے ملا۔ اس وفد میں جناب محمد یوسف فیروزی، جناب ایم۔ اے مجید اور جناب اعجاز افضل شریک تھے۔ وفد نے انجمن کے پچھلے خطوط اور سابق میئر اور دیگر حکام کارپوریشن سے گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ باوجود وعدوں کے ابتک اردو اسکولوں کی حالت میں سدھار نہیں پیدا ہوا ہے۔ ٹیچروں اور ہیڈ ماسٹروں کی مختلف اسامیاں اب بھی خالی ہیں۔ جس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ٹرینڈ استاد نہیں ملتے۔ وفد نے بتایا کہ ان اسامیوں کو جلد از جلد پر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ٹرینڈ استاد نہ مل سکیں تو مناسب صلاحیت والے غیر ٹرینڈ استادوں کا تقرر کیا جائے جو کہ بعد کو ٹریننگ حاصل کریں۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے تعلیم میں کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا ہے۔

وفد نے یہ بھی بتایا کہ بعض اردو اسکولوں میں ہندی اور بنگلہ داں استادوں کا تقرر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو داں طلبہ کی تعلیم کا نقصان ہو رہا ہے۔ انھوں نے درخواست کی کہ ایسے معلمین کو ہندی اور بنگلہ اسکولوں میں منتقل کرکے اردو داں ٹیچروں کو یہاں بحال کیا جائے۔

وفد نے یہ بھی بتایا کہ بہت سے اسکولوں میں طلبہ کے لیے کافی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ایسے اسکولوں میں زیادہ شفٹ کھولے جائیں تاکہ زیادہ طلبہ تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس سلسلے میں مومن پور، ڈاکٹر سدھر بوس روڈ۔ کاشی چودھری اسٹریٹ وغیرہ کے کا ذکر کیا بعض علاقوں میں لڑکیوں کا اسکول نہ ہونے کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آرہی ہیں انھیں بھی وفد نے پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ ان علاقوں میں لڑکیوں کے بھی اسکول کھولے جائیں۔ اراکین وفد نے یہ بھی بتایا کہ بہت سے حلقوں میں شمالاً نیو مارکٹ بہو بازار، کیلا بگان، تالی گنج، تپسیا، گجلا وغیرہ کے علاقوں میں سرے سے اردو اسکول نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان علاقوں میں جلد اردو اسکول کھولے جائیں۔

وفد نے اسکولوں میں بلیک بورڈ اور فرنیچر وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے جو دشواریاں طلبہ کو پیش آرہی ہیں ان کا بھی ذکر کیا۔ اسکول کی عمارتوں کی شکستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے وفد نے بتایا کہ اگرچہ بار بار اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اب تک عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان مسائل کی طرف فوری قدم اٹھایا جائے۔

میئر اور کمشنر صاحبان نے توجہ نامے کو غور سے پڑھنے اور اراکین وفد کی باتوں کو توجہ سے سننے کے بعد یہ وعدہ کیا کہ ان شکایتوں کو دور کرنے کی فوری کوشش کی جائے گی۔

(علقمہ شبلی، جنرل سکریٹری)

بزم ادب، اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج، اندور کا افتتاحیہ جلسہ

اردو حلقوں کے لیے یہ خبر مسرت کا باعث ہوگی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اسی سال اندور یونیورسٹی سے متعلق، اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج میں اردو، فارسی کے شعبے قائم ہوئے ہیں۔ کالج کے طلبہ کے ذوق و شوق سے پچھلے دنوں "بزم ادب" کا قیام عمل میں آیا جس کا افتتاحیہ جلسہ ۱۹ ردسمبر ۱۹۶۵ء کو منعقد ہوا۔ جلسے کا آغاز کالج کی مجلس انتظامیہ کے صدر جناب خورشید حسن خاں صاحب، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی کی بصیرت افروز تقریر سے ہوا جس میں موصوف نے اس بزم کے قیام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے عالمی تہذیب کے ارتقا میں ادب کے حصے کا جائزہ لیا۔ صدارت بزم ادب

کے سرپرست اور کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر انور علی صاحب نے فرمائی۔ مجلس انتظامیہ کے نائب صدر جناب محمد احمد خاں صاحب، ایڈوکیٹ نے بھی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ادب کے تعمیری پہلو پر زور دیا۔

شعبۂ اردو کے صدر اور بزم کے نگراں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے بزم کے قیام کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مہمان ادیبوں اور شاعروں کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد جناب عتیق حنفی نے اپنا مختصر مقالہ میر صاحب اور نئی غزل پڑھا جس میں انھوں نے اردو شاعروں کی نئی نسل پر تقی میر کے اثرات کی نشان دہی کی اور ان اثرات کی قدر و قیمت و اہمیت کا جائزہ لیا۔ مقالے کے بعد شعر و سخن کا دور شروع ہوا جس میں جناب عتیق حنفی، جناب قیصر قلندر اور جناب عادل جعفری نے نظمیں، جناب روپاین سکیم نے قطعات، جناب شمیم حنفی، جناب جیون لعل گوہر، واصق اندوری اور عزیز اندوری نے غزلیں سنائیں۔ بزم کے سرپرست جناب ڈاکٹر انور علی صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں ادب اور زندگی کے رشتوں اور ادب کے ذریعہ زندگی کی رہنمائی و تنقید پر اظہار خیال فرمایا۔ جلسے کے خاتمے پر بزم کے ناظم عزیز اندوری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(عزیز اندوری، ناظم بزم ادب)



مالک انجمن ترقی اردو (ہند) پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا